مسلم پرسنل لا

اہمیت، افادیت اور ضرورت

محمد یوسف

امیر جماعت اسلامی ہند

J.D. ASLAM

مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۶

مطبوعات اشاعتِ اسلام ٹرسٹ ——— ۹۹

مُسلم پرسنل لا

اہمیّت، افادیت اور ضرورت

محمد یوسف

امیر جماعتِ اسلامی ہند

مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ——— ۱۱۰۰۰۶

بارِ اوّل ـــــــ جنوری ۱۹۷۳ء ـــــــــــ ۶۰۰۰

قیمت ـــــــــــــــــــــــــ ۴۰ پیسے

لبرٹی آرٹ پریس، دہلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حکومت کو مسلم پرسنل لا میں مداخلت کا کوئی حق حاصل نہیں ہے

آپ کسی بھی راسخ العقیدہ مسلمان سے سوال کیجئے کہ وہ اسلامی شریعت سے اتنی محبت کیوں کرتا ہے تو اس کا سیدھا سادہ جواب وہ یہ دے گا کہ ایک فرد جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان رکھتا ہے وہ فی الحقیقت ان کی اطاعت و فرماں برداری کا عہد کرچکا ہے اور اس عہد کو اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ کہہ کر دن رات میں بار بار دہراتا رہتا ہے۔ اُس کی گھٹی اور فطرت میں یہ بات ودیعت ہوچکی ہے کہ وہ اس دین اور شریعت سے محبت کرے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کی معرفت نازل فرمایا ہے اور اس طرح اپنی چند روزہ زندگی میں خدا کے ساتھ اپنی وفاداری کا ثبوت پیش کرے۔

آپ اس سے اگر یہ سوال کریں کہ وہ اپنے پرسنل لا میں ترمیم کیوں نہیں چاہتا تو وہ دوٹوک لفظوں میں یہی کہے گا کہ چونکہ اسلامی شریعت کو وہ مکمل اور دین کا جزء سمجھتا ہے نیز تمام دنیا کے قوانین سے بالا و برتر، اصلح اور کامل سمجھتا ہے اس لئے وہ مسلم پرسنل لا میں جو شریعتِ اسلامیہ ہی کا ایک حصہ ہے، کسی کتر بیونت کا قائل نہیں ہے۔

وہ آپ کو یہ بھی تبلائے گا کہ وہ اس بات پر یقینِ کامل رکھتا ہے کہ اس چند روزہ زندگی کے مقابلہ میں آخرت کی زندگی بدرجہا بہتر بھی ہے اور دوامی بھی اور وہ یوم حساب کی اس باز پرس سے ڈرتا ہے کہ اس نے اس مختصر سی زندگی میں خدا اور اس کے رسولؐ کے احکام کی فرمانبرداری کیوں نہیں کی۔ اس کا عقیدہ ہے کہ اسلام صرف نماز، روزہ کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ایک مکمل دین ہے جس کے ہر جزکی اتباع اسی طرح لازم ہے جس طرح نماز، روزہ کے احکام کی۔ لہٰذا اگر وہ ان تمام احکام کی پابندی کرتا ہے، جن میں اس کا پرسنل لا بھی شامل ہے تو وہ امید رکھتا ہے کہ خدا اپنے فضل سے اس کو دائمی مسرت کے اُس مقام میں داخل کرے گا جس کا نام جنت ہے۔ لیکن اگر اس نے کسی حکم کی نافرمانی کی، خواہ وہ پرسنل لا ہی کے ذیل کی کیوں نہ ہو تو اس کو سخت عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا جس کے تصور ہی سے اس کی روح لرز جاتی ہے۔

وہ بہت سنجیدگی کے ساتھ آپ سے یہ بھی کہے گا کہ خدا کے ماننے والے اگر اس کے کسی ایک حکم میں کتر بیونت کرنے لگیں تو ایسے لوگ نہ صرف یہ کہ دوسرے احکام خداوندی کی کاٹ چھانٹ میں جری ہو جائیں گے بلکہ کسی بھی مروجہ قانون اور لیجسلیچر کے احکام کی پابندی سے بھی گریز کرنے لگیں گے۔

ممکن ہے، حکومت ہماری ان باتوں کو فرقہ واریت پر محمول کرے کیونکہ ہمارا تعلق جماعتِ اسلامی سے ہے اور جماعت کو حکومت آئے دن بلا وجہ مطعون کرتی رہتی ہے، لیکن اگر اپنے مذہب کی باتیں بیان کرنے اور ان پر یقینِ کامل رکھنے کا نام فرقہ واریت ہے تو ہم بخوشی اس الزام کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں، البتہ حکومت کو یہ تبلائے دیتے ہیں کہ یہ خیالات صرف جماعتِ اسلامی کے نہیں ہیں بلکہ سارے ہی مسلمانوں کے ہیں۔ اس سلسلے میں مناسب ہوگا کہ انڈین نیشنل کانگریس کے ایک سابق صدر اور حکومتِ ہند کے ایک ممتاز مرکزی وزیر مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی رائے غور سے

سُن لی جائے، جن کے الفاظ یہ ہیں:۔

"اسلام کے احکام کوئی راز نہیں جن تک گورنمنٹ کی رسائی نہ ہو، چھپی ہوئی کتابوں میں مرتب ہیں اور مدرسوں کے اندر شب و روز لوگ ان کا درس دیتے ہیں، پس گورنمنٹ کو چاہئے کہ صرف اس بات کی جانچ کرے کہ واقعی اسلام کے شرعی احکام ایسے ہی ہیں یا نہیں؟ اگر ثابت ہو جائے کہ ایسا ہی ہے تو پھر صرف دو ہی راہیں گورنمنٹ کے سامنے ہونی چاہئیں۔ یا مسلمانوں کے لئے ان کے مذہب کو چھوڑ دے اور کوئی ایسی بات نہ کرے جس سے ان کے مذہب میں مداخلت ہو یا پھر اعلان کر دے کہ اس کو مسلمانوں کے مذہبی احکام کی کوئی پروا نہیں ہے، نہ اس پالیسی پر قائم ہے کہ ان کے مذہب میں مداخلت نہ ہوگی۔ اس کے بعد مسلمانوں کے لئے بھی نہایت آسان ہو جائے گا کہ اپنا وقت بے سود شور و فغاں میں ضائع نہ کریں اور برٹش گورنمنٹ اور اسلام اِن دونوں میں سے کوئی ایک بات اپنے لئے پسند کریں"

(مسئلہ خلافت و جزیرۂ عرب ص۲۰۴ ص۲۰۵ طبع ثانی)

ہمیں پورا یقین ہے کہ مولانا آزاد مرحوم اگر آج زندہ ہوتے تو وہ بھی "اسلام کے شرعی احکام" کے سلسلہ میں جماعتِ اسلامی ہی کی صف میں نظر آتے۔

دراصل یہ باتیں جماعتِ اسلامی یا ہندوستان کے مسلمانوں کی من گھڑت نہیں ہیں بلکہ یہ اسلام کا مسلّمہ اصول اور مسلمانانِ عالم کا متفقہ مسلک رہا ہے کہ احکامِ خداوندی میں کوئی بھی ترمیم نہیں کی جا سکتی۔

ایک بے وزن بات

مسلمانوں کو مغالطہ دینے کے لئے یہ بات بار بار دہرائی جاتی ہے کہ فلاں مسلم ملک نے مسلم پرسنل لا میں

تبدیلی کردی ہے اس لئے ہندی مسلمانوں کو بھی اپنے پرسنل لا میں تبدیلی کر دینی چاہئے۔ لیکن یہ دلیل ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ فلاں فلاں مسلمان چونکہ شراب پیتے ہیں یا جوا کھیلتے ہیں تو کیوں نہ دوسرے مسلمان بھی ایسا ہی کریں۔ ظاہر ہے کہ ایسے استدلال کو استدلال کہنا استدلال کی توہین ہے۔ یہاں سوال اصول کا ہے، نہ کہ کسی کے عمل کا۔ اگر کسی کا عمل اصول کے خلاف ہے تو ایسے عمل کو غلط قرار دیا جائے گا۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ شریعت کے کسی منصوص جزء میں ترمیم کا کسی کو کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ خواہ اقدام کوئی کرے۔ بفرضِ محال ساری دنیا کے مسلمان متفقہ طور پر بھی اگر کسی حکم خداوندی میں ترمیم کر دیں تو ان کا یہ اقدام غلط ہی ہوگا کیوں کہ وہ اس کے قطعی مجاز نہیں ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے بموجب کہ "لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ اللهِ" ایسے تمام احکام و قوانین دیوار پر دے مارنے کے قابل ہیں جو کتاب و سنت سے بے نیاز ہو کر بنائے گئے ہوں۔ جو لوگ ایسے احکام وضع کریں ان کو ڈرنا چاہئے کہ خدا کی سزا بڑی سخت ہے۔

اب ان "تبدیلیوں" کی بھی حقیقت جان لینی چاہئے جو بعض مسلم ممالک نے مسلمانوں کے پرسنل لا میں کی ہیں۔ یہ حقیقت فی الاصل بس اتنی ہے کہ جن ممالک میں مسلم پرسنل لا میں "ترمیم و اصلاح" کی گئی ہے ان سب میں سوائے دو ملکوں کے ——— یہ "ترمیم و اصلاح" تمام تر حدودِ شریعت کے اندر رہتے ہوئے کی گئی ہے، یعنی کسی ایک ہی مکتبِ فقہ کے بجائے مختلف فقہی مسالک کو سامنے رکھ کر اخذ و انتخاب کا طریقہ اختیار کر کے ایک مجموعۂ قوانین مدوّن کر لیا گیا ہے، یعنی اس مجموعۂ قوانین کا سرچشمہ بہرحال اسلامی ذخیرۂ فقہ ہی ہے۔ پھر اس سلسلے میں جو کچھ کیا ہے وہ خود مسلمانوں ہی نے کیا ہے اور علماء و ماہرینِ قانونِ اسلام کے مشورے سے کیا ہے، غیر مسلمین کا اس میں کوئی دخل نہیں رہا ہے۔ اس ذیل میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان مسلمان ملکوں نے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے لئے یکساں سول کوڈ بنانے کی کوشش نہیں کی ہے جیسا کہ ہمارے ملک کے سیاست دانوں کے پیشِ نظر ہے، بلکہ غیر مسلموں

کے لئے ان کے پرسنل لا محفوظ رکھے گئے ہیں۔

اس بات کو پھر ذہن نشیں کر لینا چاہئے کہ اگر کسی مسلم ملک نے کوئی ایسی تبدیلی کی بھی ہو جو قرآن وسنت کے خلاف ہو تو خدا اور رسول کے مقابلہ میں یہ ایک باغیانہ روش اور غیر مجاز عمل ہے جس کو نہ تو نظیر بنایا جا سکتا ہے، نہ اس کو بنیاد بنا کر قرآن وسنت کے مطابق عمل کرنے پر اصرار کرنے والوں کے مقابلہ میں کوئی حجت قائم کی جا سکتی ہے۔ کتاب وسنت ہی دراصل مسلمانوں کی پوری زندگی کے لئے مشعل راہ ہیں اور ان کا ہر چھوٹا بڑا حکم ان کے لئے واجب الاتباع ہے۔

ایک غلط دعویٰ

عام طور سے یہ دعویٰ بھی کیا جاتا ہے کہ ہندوستان کے دستور کی رو سے پارلیمنٹ کو مسلم پرسنل لا میں ترمیم کا حق حاصل ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ دستورِ ہند کے کچھ اجزاء بنیادی ہیں اور کچھ غیر بنیادی —— ان بنیادی اجزاء میں ترمیم کا کسی پارلیمنٹ کو اختیار حاصل نہیں ہے۔ ہندوستان کے شہریوں نے ملکی ڈھانچے اور نظام کو اس وجہ سے قبول کیا ہے کہ اس میں بنیادی حقوق کی دفعات موجود ہیں۔ ان حقوق میں کاٹ چھانٹ سے اندیشہ ہے کہ ایک نئے انقلاب کا دروازہ کھل جائے۔ ہندوستانی شہری اس بات کے قائل نہیں ہیں کہ وہ عارضی طور پر کامیابی حاصل کرنے والی پارٹیوں کی خواہشات پر ہوا کے اکھڑے ہوئے پتوں کی طرح اڑتے رہیں بلکہ انھوں نے بجا طور پر کچھ ایسی مستقل بنیادوں کو دستور میں جگہ دے رکھی ہے جو بنیادی انسانی حقوق کی ضامن ہیں اور اہلِ ملک کی ہر اٹھنے والی قیادت کو پابند کیا ہے کہ وہ ان بنیادوں میں رخنہ اندازی نہ کرے

یہ صحیح ہے کہ دستورِ ہند میں بنیادی حقوق کے باب کے بعد رہنما اصولوں کے باب کے تحت ایک دفعہ میں مشترکہ سول کوڈ کا تصور بھی دیا گیا ہے لیکن لوگوں کو مغالطہ میں نہ رہنا چاہئے کہ ریاست اس کی عملاً بھی پابند ہے۔ اس سلسلے میں ایک واضح مثال شراب بندی کے قانون کی ہے جو رہنما اصولوں میں درج ہے لیکن حکومت اسے ایک بار نافذ کر کے اب دھیرے دھیرے ختم کرتی جا رہی ہے۔ اس

ضمن میں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ دستورِ ہند کی رو سے کسی شہری کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ حکومت اگر کسی رہنما اصول پر عمل درآمد کرنے سے قاصر رہے تو عدالتی چارہ جوئی کر کے اسے مجبور کیا جا سکے۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ دستورِ ہند میں یکساں سول کوڈ کی دفعہ ۴۴ دستور کے چوتھے باب کا ایک جزء ہے۔ دستور کے چوتھے باب میں چند وہ رہنما اصول مندرج ہیں جن کو پیش نظر رکھ کر حکومت کو قانون سازی کرنی ہے۔ دفعہ ۴۴ کے الفاظ یہ ہیں:۔

"ریاست ملک کے تمام شہریوں کے لئے ایک مشترک سول کوڈ مہیا کرنے کی کوشش کرے گی۔"

دستور کے باب سوم کا عنوان ہے "بنیادی حقوق" اور اس باب میں ہندوستان میں رہنے والے تمام ہی باشندوں کے لئے چند حقوق کو ان کے بنیادی حقوق کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے اور ان کے تحفظ کی ضمانت دی گئی ہے۔ ان بنیادی حقوق میں سے ایک حق مذہب کو اختیار کرنے، اس پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے کا ہے (دفعہ ۲۵) اور اسی باب میں دفعہ ۲۹ کے ذریعہ یہاں کے شہریوں کے ہر طبقہ کو اپنے مخصوص کلچر کو برقرار اور محفوظ رکھنے کے حق کی ضمانت دی گئی ہے۔

دستورِ ہند کے ان دونوں ابواب یعنی باب سوم اور باب چہارم کے تقابلی مطالعہ سے یہ بات نکھر کر سامنے آتی ہے کہ بنیادی حقوق کو رہنما اصولوں پر فوقیت اور بالادستی حاصل ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اگر کوئی رہنما اصول کسی بنیادی حق سے متصادم ہو تو اس رہنما اصول کو پس پشت ڈال دیا جائے گا۔ اس فرق کو متعین کرنے والے چند وجوہ یہ ہیں۔

بنیادی حقوق کے متعلق دستور ہی کی دفعہ ۳۲ میں اس بات کی صراحت کر دی گئی ہے کہ ہر بنیادی حق کو سپریم کورٹ کے ذریعہ نافذ کرایا جا سکے گا۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ دفعہ ۳۲ کی گنجائش دفعہ ۲۲۶ سے مستزاد ہے جس کے تحت ہر ہائی کورٹ میں کسی بھی حق کے نفاذ کے لئے رٹ داخل

کی جاسکتی ہے۔ اس دفعہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر ریاست کسی بھی فرد کو کسی قانون کے ذریعے یا کسی عاملانہ حکم کے ذریعہ اس کے کسی بنیادی حق سے محروم کرے تو وہ اس قانون یا حکم کو عدالت میں چیلنج کرکے اس کی منسوخی کا فیصلہ حاصل کرسکتا ہے۔

لیکن رہنما اصولوں کے تعلق سے ایسی کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی ہے اور قانون دانوں کے درمیان یہ بات متفق علیہ ہے کہ اگر ریاست کسی رہنما اصول کو اختیار کرنے میں قصور اور کوتاہی کرے تو کسی عدالت کے ذریعہ ریاست کو اسے اختیار کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ اس صورتِ حال سے بھی بنیادی حقوق کی رہنما اصولوں پر بالادستی واضح ہوتی ہے۔

بنیادی حقوق کو دفعہ ۱۳ ضمن ۲ کے ذریعہ مزید مستحکم کردیا گیا ہے۔ اس دفعہ کی رو سے ریاست کے اختیاراتِ قانون سازی پر یہ صریح تحدید عائد کی گئی ہے کہ ریاست کوئی ایسا قانون نہیں بنا سکتی جس سے بابِ سوم میں مندرج بنیادی حقوق میں سے کسی حق پر کوئی ضرب پڑتی ہو۔

رہنما اصولوں کے باب میں ایسی کوئی مثبت یا منفی نوع کی دفعہ شامل نہیں ہے جس سے ریاست پر کوئی لزوم عائد ہوتا ہے، یا شہریوں کے حقوق کو محدود کیا گیا ہو۔

دستور کے باب سوم میں جن بنیادی حقوق کی ضمانت دی گئی ہے وہ اپنی نوع میں بنیادی انسانی حقوق ہیں جو انسان کے فطری عز و شرف کا خاصہ ہیں اور جن کو آج کی ہر متمدن ریاست تسلیم کرتی ہے نیز وہ اقوامِ متحدہ کے منشور برائے بنیادی حقوق میں بھی شامل ہیں اور اس منشور پر دستخط کرکے حکومت ہند نے بھی ان کو تسلیم کرلیا ہے۔ اسی لئے باب سوم میں بیشتر بنیادی حقوق کی ضمانت (بشمول دفعہ ۲۵ میں دی ہوئی مذہبی آزادی کے) تمام لوگوں کے لئے ہے، جبکہ یکساں سول کوڈ کا دائرہ صرف ہندوستان کے شہریوں تک ہی محدود ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ مذہبی آزادی کے بنیادی حق سے ہندوستان میں رہنے والا مقیم کوئی بھی شخص حتیٰ کہ ایک غیر شہری بھی جو عارضی طور پر ہندوستان

میں مقیم ہو مستفید ہو سکتا ہے اور اس کے تحفظ کے لئے ہندوستان کی عدالتوں کی پشت پناہی اسے حاصل ہوگی۔ رہنما اصول کے مقابلے میں بنیادی حقوق کا یہ عموم بھی ان کی بالادستی کو ظاہر کرتا ہے۔

س طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگر پارلیمنٹ یا کوئی ریاستی مجلسِ قانون ساز ایسا قانون وضع کرے جو دستور میں دیے ہوئے بنیادی حقوق سے متصادم ہو تو وہ قانون غیر آئینی ہوگا اور یہی بات یکساں سول کوڈ کے لئے بھی ہے۔

یہ حقیقت بھی مسلّمہ ہے کہ پارلیمنٹ ایک ایسا ادارہ ہے جو دستورِ ہند کی بعض دفعات کے نتیجے میں وجود میں آیا ہے، اس لئے اس کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ دستور کے صحیح منشا کے خلاف کوئی قانون وضع کرے اور اس کے ذریعہ اقلیتوں کے بنیادی حقوق کو غصب کرلے۔ دستور ہر حال میں پارلیمنٹ سے بالاتر ہے۔ اس کی بالادستی کے علی الرغم پارلیمنٹ اگر کوئی ایسا قانون وضع کرتی ہے جو ان بنیادی حقوق سے متصادم ہو تو یہ سمجھا جائے گا کہ پارلیمنٹ نے اپنی حدود سے تجاوز کیا ہے اور ان سب لوگوں کو جو ایسا قانون وضع کرنے میں کسی حیثیت سے شریک ہوں یہ سمجھا جائے گا کہ ان کا یہ اقدام حلفِ وفاداری کے خلاف ہے جو انھوں نے دستورِ ہند کے مطابق عمل کرنے کے سلسلے میں اٹھایا ہے۔

دستورِ ہند کی مذکورہ بالا خصوصیات کی بنا پر یہ نتیجہ نکالنا بالکل صحیح ہے کہ پارلیمنٹ کو مسلم پرسنل لا میں ترمیم کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ اس لئے کہ مسلم پرسنل لا دینِ اسلام کا ایک اہم جزء اور اسلامی کلچر میں داخل ہے، لہٰذا کوئی ایسا قانون نہیں بنایا جاسکتا جو اس کلچر پر ضرب لگاتا ہو۔

مشترکہ سِول کوڈ کی ایک جھلک

مسلم پرسنل لا کے سلسلے میں ہمیں ایک اور اندیشہ بھی لاحق ہے جس سے خبردار رہنے کی ضرورت ہے۔ یہ اندیشہ اس شکل میں سامنے آرہا ہے کہ اس وقت ایسے متعدد قوانین منظور کئے گئے ہیں اور کئے جاسکتے ہیں جو مسلم معاشرہ کے شخصی قوانین پر اثر ڈالنے والے ہیں اور جو مشترک سول کوڈ میں شامل ہیں۔ مثلاً بچوں کی تبنیت (Child Adoption) کے سلسلہ

میں اس وقت عام آبادی پر ایک قانون نافذ کرنا حکومت کے پیش نظر ہے جس کو (Adoption of Children Bill 1972) کے نام سے پاس کرانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ یاد رہے کہ پارلیمنٹ میں یہ بل حکومت کی طرف سے پیش کیا گیا ہے، لہٰذا یہ کہنا کہ حکومت مسلم پرسنل لا کو ابھی بدلنا نہیں چاہتی، صحیح نہیں ہے۔ صاف دیکھا جاسکتا ہے کہ غیر محسوس طریقہ پر پرسنل لا میں تبدیلیوں کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس بل کی دفعہ ۱۳ ملاحظہ ہو۔

دفعہ ۱۳: "تبنیت کا اثر" (۱) حکمِ تبنیت اُس تاریخ سے نافذ متصور ہوگا جس تاریخ کی صراحت ڈسٹرکٹ کورٹ نے اپنے حکمنامہ میں کی ہو یا اگر تحت دفعہ ۱۲ اس حکم کے خلاف کوئی مرافعہ کیا گیا ہو تو اس تاریخ سے جس کی صراحت عدالتِ مرافعہ کے حکم میں کی گئی ہو۔

(۲) وہ بچہ جس کے بارے میں حکمنامۂ تبنیت جاری ہوا ہو حکمنامہ میں مندرج تاریخ سے جملہ اغراض کے لئے (بہ شمول بلا وصیت انتقال کی صورت کے) مثل اپنے متبنیٰ گیرندہ کے حقیقی بچّہ کے اور اس کے متبنیٰ گیرندگان مثل اس کے حقیقی والدین کے متصور ہوں گے۔ گویا کہ وہ ان کے رشتۂ مناکحت کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے اور اس تاریخ سے اس بچہ کے جملہ تعلقات اپنے خاندانِ پیدائش سے منقطع اور متبنیٰ گیرندگان کے خاندان سے قائم شدہ متصور ہوں گے مگر شرط یہ ہے کہ:-

(الف) وہ بچہ کسی ایسے فرد سے شادی نہ کرسکے گا جس سے وہ شادی نہ کرسکتا اگر وہ اپنے خاندانِ پیدائش ہی میں رہتا۔

(ب) اگر کوئی جائداد تاریخِ حکم نامۂ تبنیت سے قبل اس بچہ کو حاصل ہوچکی تھی تو تابع ان کے شرائط (اگر کوئی ہوں) جن کے تحت وہ اس بچّے کو حاصل ہوئی تھی، وہ اس بچے کی ملکیت میں باقی رہیگی۔

(ج) تبنیٰ کسی فرد کو کسی ایسی جائداد کے حقوقِ ملکیت سے محروم نہ کرے گا جو حکمنامۂ

تبنیت سے قبل اس فرد کو حاصل ہو چکے ہوں۔"

متبنّٰی کے یہ حقوق بعینہٖ وہی ہیں جو Hindu Adoption and Maintenance Act 1956 کے تحت ہندوؤں کے سلسلے میں مقرر کئے گئے ہیں اور اب ان کو سب ہندوستانیوں پر لاگو کیا جانا پیشِ نظر ہے۔

چنانچہ ۷۲ء کے اس بل کے اغراض و مقاصد میں یہ بات واضح طور پر کہی گئی ہے کہ اس مسودۂ قانون کا مقصد تبنیت کے بارے میں مروجہ ہندو قانونِ تبنیت و گذارہ کے جزو متعلقہ تبنیت اور اس سلسلہ کے سارے رواجی قوانین کو ختم کر کے ایک ایسا قانون بنانا ہے جو تمام فرقوں پر لاگو ہو۔

اس سے قیاس کر لیجئے کہ مشترکہ سول کوڈ کس طرح اکثریت کے مزاج اور روایات کا عکس بن کر سامنے آنے والا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن و سنت نے مسلمان خاندانوں کے نظم و استحکام کے لئے جو شخصی قوانین بنائے ہیں ان پر اگر آزادانہ اور غیر متعصبانہ طور پر غور کیا جائے تو ہر منصف مزاج انسان یہ مطالبہ کرنے پر اپنے آپ کو آمادہ پائے گا کہ ان قوانین کو مسلم سماج کے لئے خاص رکھنے کے بجائے ملک گیر اور آفاقی حیثیت دی جانی چاہئے، کیونکہ ان کے علاوہ خاندان کا استحکام اور سماجی انصاف کسی اور طرح ممکن ہی نہیں۔ مگر بُرا ہو تنگ نگاہی کا کہ اس کے باعث ایسے مفید اور جامع قوانین سے استفادہ کرنا تو درکنار، الٹا ان لوگوں کو بھی اس سے محروم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے جو ان کو اپنائے ہوئے ہیں۔

ہم یقیناً اس وقت ایک اجنبی ماحول میں گھرے ہوئے ہیں، تاہم مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ تاریکی کا وجود ہی اس امر کا متقاضی ہے کہ اس میں روشنی کا چراغ جلایا جائے۔ ہمیں اپنی جگہ اس وقت ایک طرف تو یہ عزم کر لینا چاہئے کہ اپنے معاشرہ میں اسلامی روح کے مطابق خاندانوں کی اصلاح کریں گے

اور ہمارا ایک ایک گھر خدمتِ دین اور اقامتِ دین کا روشن منارہ بنے گا، دوسری جانب ملی پیمانہ پر ہماری طرف سے اس بات کا متفقہ اظہار ہونا چاہئے کہ مسلم پرسنل لا میں ترمیم وتبدیلی کا کسی حکومت یا پارلیمنٹ کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔

ڈاکٹر امبیدکر کا انتباہ

اس ذیل میں یہ تذکرہ فائدہ سے خالی نہ ہوگا کہ جب مجلسِ دستور ساز میں مجوزہ دستور پر دفعہ وار بحث ہو رہی تھی اور یہ دفعہ ۴۴ (جو مسودۂ دستور میں دفعہ ۳۵ تھی) زیرِ بحث آئی تو بعض ممبرانِ مجلسِ دستور ساز نے اس کی شدت سے مخالفت کی اور ان تقریروں سے یہ بات بھی کھل کر سامنے آئی کہ اس کی مخالفت صرف مسلمان ہی نہیں کرتے بلکہ خود ہندوؤں کا بھی ایک بڑا طبقہ مشترک سول کوڈ کا مخالف ہے اور اس کو مداخلت فی الدین اور دستور میں دیئے گئے بنیادی حقوق کے مغائر سمجھتا ہے اس موقع پر ڈاکٹر امبیدکر نے، جنھوں نے دستور کا مسودہ تیار کرنے میں نمایاں حصہ لیا تھا، اس بارے میں فرمایا تھا:۔

"ریاست صرف یہ چاہتی ہے کہ اسے اس طرح ایک قانون بنانے کا حق حاصل ہو جائے اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ریاست پرسنل لا کو ختم کرنے کی پابند ہو جائے۔ لہٰذا کسی شخص کو اس بات کا اندیشہ نہیں ہونا چاہئے کہ اگر ریاست نے اپنے لئے اس قسم کا اختیار حاصل کر لیا ہے تو وہ فوراً ہی اس اختیار کا استعمال اور اس کو اس طرح نافذ کر بھی دے گی جو مسلمانوں یا عیسائیوں یا دوسرے فرقوں کے لئے قابلِ اعتراض ہو۔

کوئی بھی ریاست اپنے اختیارات کا استعمال اس طرح نہیں کر سکتی جس کے باعث مسلمانوں کو بغاوت پر آمادہ ہو جانا پڑے۔ اگر ریاست ایسا کرے تو میری دانست میں یہ پاگل پن ہوگا۔"

اس بحث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ صرف دفعہ ۴۴ کے تحت یکساں سول کوڈ کے خطرہ سے اپنے کو محفوظ کر لینے پر بات ختم ہو جاتی ہے۔ صورتِ حال یہ ہے کہ اس وقت بھی ملک میں چند ایسے قوانین نافذ ہیں جو مسلم پرسنل لا سے متصادم ہیں۔ ان میں سے خصوصیت سے Special Marriage Act قابلِ ذکر ہے۔ یہ قانون ہندوستان کی آزادی کے بعد ہماری پارلیمنٹ نے ۱۹۵۴ء میں بنایا ہے۔ اس کی رو سے نکاح کے لئے نہ تو جانبین کا ہم مذہب ہونا ضروری ہے اور نہ ہی نکاح کے منعقد ہونے کے لئے کسی مذہبی رسم کا ادا کرنا، صرف حکومت کے ایک عہدہ دار کے پاس اس بات کا تحریری اقرار کافی ہے کہ طرفین قانونِ مذکورہ کے تحت رشتۂ مناکحت میں بندھ رہے ہیں۔ اس قانون کے تحت شادی کے بعد طرفین اور ان کی اولاد وراثت کے باب میں Indian Succession Act سے متعلق ہوں گے نہ کہ ان میں سے کسی ایک کے شخصی قانونِ وراثت سے۔ اس قانون کا ایک عجیب پہلو یہ ہے کہ اگر طرفین ایک ہی مذہب کے ہوں یعنی مرد اور عورت دونوں ہندو یا دونوں مسلمان ہوں تب بھی اس قانون کے تحت شادی کر لینے کے نتیجہ میں ان کا مذہبی قانونِ وراثت ان سے متعلق نہ ہوگا، بلکہ مذکورہ بالا قانون Indian Succession Act ان سے متعلق ہوگا جو ہندو قانونِ وراثت اور اسلامی قانونِ وراثت دونوں سے مختلف ہے۔

اس طرح کے تمام قوانین کو منسوخ کرانے کی ضرورت ہے، یا یہ کم از کم طے کرا لیا جائے کہ ان قوانین کا اطلاق مسلمانوں پر نہ ہوگا۔

اسی طرح اس وقت عدالتوں میں جو محمڈن لا رائج ہے وہ فی الواقع اینگلو محمڈن لا ہے اور اس میں متعدد قوانین شریعت سے متصادم یا مختلف ہیں۔ ان تمام قوانین پر نظرِ ثانی کر کے انھیں کتاب و سنت اور فقہِ اسلامی کے مطابق بنانے کی ضرورت ہے۔

اس قسم کے غیر اسلامی قوانین یا قوانین مروجہ کے غیر شرعی اجزاء کو شریعت اسلامیہ کے مطابق بنانے کا کام ظاہر ہے کہ ہر کہ و مہ کے بس کی بات نہیں بلکہ اس کے لئے وہی لوگ اہل ہیں جن کو کتاب و سنت کا کماحقہٗ علم حاصل ہو اور جو اسلامی فقہ، اسلامی فلسفۂ قانون اور اسلامی تاریخ پر عبور کے ساتھ ساتھ ان معاملات میں بصیرت بھی رکھتے ہوں۔

قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ

(ماہنامہ "زندگی" رام پور مسلم پرسنل لاء نمبر دسمبر ۷۲ء)

اسلامی قوانینِ شخصی کا مرتبہ و مقام

عقل اور تجربہ کی روشنی میں

(یہ مقالہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا کنونشن بمبئی منعقدہ ۲۷، ۲۸ دسمبر ۷۲ء کے اجلاسِ اوّل میں پڑھا گیا تھا جو ترمیم و اضافہ کے بعد شائع کیا جا رہا ہے)

الحمد للہ رب العٰلمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ الکریم وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین

معزز صدرِ مجلس اور محترم حاضرین!

آج کل ہمارے یہاں زندگی کے ایک ایک شعبے میں جو تبدیلیاں لائی جا رہی ہیں یا جن کے منصوبے بن رہے ہیں، ان میں سے کچھ اگر معقول اور قابلِ تعریف ہیں تو کچھ معقولیت اور عاقبت اندیشی سے ہٹی ہوئی اور باعتبارِ نتیجہ تباہ کن بھی ہیں کیونکہ ان کے نتیجے میں انسانی عظمت اور اخلاقی قدروں کو پسِ پشت ڈال دیا گیا ہے۔ فکر و عمل کا یہ انداز سر تا سر مغربی تہذیب کی اندھی تقلید اور ذہنی غلامی کی پیداوار ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اس تہذیب کی بنیاد مادیت پر رکھی گئی ہے اس لئے وہ عین اپنی فطرت کے اعتبار سے دین و اخلاق کے بارے میں بے درد واقع ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دین و اخلاق کو معاملات و عبادت گاہوں تک میں پناہ نہیں لینے دے رہی ہے۔ اس کی اسی

یلغار کا نتیجہ ہے کہ شخصی اور عائلی معاملات کو بھی دین کے دائرۂ اثر سے باہر نکال لیا گیا ہے اور اب ہم مسلمانوں سے بھی کہا جا رہا ہے کہ اپنے پرسنل لاء سے دست بردار ہو کر نا مذہبی بنیادوں پر بنائے جانے والے سول کوڈ کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو جاؤ، حالانکہ قطعِ نظر اس حقیقت سے کہ یہ دینی قوانین ہیں جن میں ترمیم و تنسیخ کا کوئی بھی مجاز نہیں، اپنی ذاتی خوبیوں Personal Merits کے اعتبار سے بھی یہ ایسے قوانین ہیں جن سے بہتر تو کیا ان کے ہم پلّہ قوانین بھی کہیں نہیں پائے جاتے۔ یہ صرف عقیدت کا دعویٰ نہیں ہے بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے جس پر تاریخ کی شہادت اور عقل و فطرت کی گواہیاں موجود ہیں۔

دوسری قوموں کا اکتسابِ فیض

تاریخ کی شہادت یہ ہے کہ قومیں اور ملتیں اسلامی قوانینِ شخصی کی مسلسل خوشہ چینیاں کرتی چلی آ رہی ہیں۔ کسی قوم کا پرسنل لاء زوجین کے باہمی حقوق و فرائض میں عدل و اعتدال سے بالکل خالی تھا تو کسی کا طلاق اور خلع کی اجازتوں سے نا آشنا۔ کہیں دوسری قرابت دار عورتیں ہی نہیں، بیٹیاں تک ترکے سے یکسر محرومِ قرار پائی ہوئی تھیں تو کہیں صرف بڑے بیٹے ہی کیلئے استحقاقِ وراثت مخصوص تھا۔ کہیں نکاحِ بیوگان کی گنجائش ناپید تھی تو کہیں عورت کی شخصیت کو مرد کی شخصیت کے تابعِ محض بنا دیا گیا تھا۔ لیکن آج ہم دیکھتے ہیں کہ تقریباً ہر جگہ ان غیر منصفانہ بندشوں اور حق تلفیوں کا خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ چاہے زبانیں اعتراف نہ کریں لیکن قلوب اس اعتراف سے بے بہرہ نہیں ہو سکتے کہ مختلف قوموں کے شخصی قوانین میں اس طرح کی تبدیلیاں بہت کچھ اسلامی قوانین ہی سے کسبِ فیض کا ثمرہ ہیں، یہ دوسری بات ہے کہ اسلام کی قدر و عظمت کے کھلے اعتراف کی توفیق نہ ہونے کے باعث قدرتی طور پر یہ اکتسابِ فیض ناقص رہا اور یہ تبدیلیاں، بجائے خود اعتدال سے ہٹی ہوئی ہیں۔ لیکن پھر بھی ان کے ذریعہ اصلاح ایک حد تک یقیناً ہوئی ہے اور ہم آج اسلامی قوانین

کے کتنے ہی اصول اور اجزاء کو ان قوانین کے اندر سمویا ہوا پاتے ہیں۔ یہ اسلام کے دیئے ہوئے شخصی قوانین کی برتری کا تاریخ کی زبان سے اعتراف نہیں تو اور کیا ہے؟

اسلامی قوانین کا دوسرا امتیازی وصف اور اس کی فطری برتری، کم از کم وضعی قوانین اور سول کوڈ کے مقابلے میں یہ ہے کہ وہ اپنی پشت پر خالق کائنات کی سند اور اتھارٹی رکھتے ہیں جس کے باعث ان کا، دلوں میں پورا پورا احترام موجود ہوتا ہے اور ان کی پابندی حکم خداوندی اور کارِ عبادت سمجھ کر کی جاتی ہے، جب کہ کسی بھی وضعی قانون اور سول کوڈ کی پشت پر ایسی کوئی سند اور اتھارٹی نہیں ہوتی، اس لئے لوگوں کے دلوں میں ان کے لئے وہ جذبۂ احترام کبھی نہیں پیدا ہو سکتا جو انھیں ان کی ہر حال میں پابندی پر برضا و رغبت آمادہ رکھ سکے۔ قانون کی افادیت اگر اس امر پر موقوف ہے کہ اس کی بہتر سے بہتر پابندی کی جائے اور اسے توڑتے رہنے کا رجحان نہ پایا جائے تو کوئی بھی انصاف پسند بتائے کہ اس پہلو سے اسلامی قوانین کے مقابلے میں وضعی قوانین کی کیا قدر و قیمت ہے؟ امتناعِ شراب کی تاریخی مثال دنیا کے سامنے ہے۔ جب اسلام نے شراب کی حرمت کا اعلان کیا تو لبوں سے لگے ہوئے پیالے پھینک دیئے گئے اور پورے معاشرے نے مے نوشی کا تصور تک بھلا دیا۔ مگر جب امریکہ نے شراب کی ممانعت کا قانون پاس کیا تو اس کے پرزے اڑا کر رکھ دیئے گئے اور اب یہی حشر ہمارے ملک میں بھی اس ممانعت کا ہو رہا ہے۔ اگر بصیرت کی آنکھیں بالکل ہی بے نور نہ ہو گئی ہوں تو یہ تجربے اس حقیقت کا ادراک کرا دینے کے لئے بالکل کافی ہیں کہ مسلم پرسنل لا اصلاً فرمودۂ خدا اور رسولؐ ہونے کے باعث ایک ایسی خوبی اور عظمت کا مالک ہے جو وضعی قوانین کو کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔

حضرات! اسلام کے دیئے ہوئے شخصی قوانین کی افضلیت پر بحیثیتِ مجموعی روشنی ڈالنے کے لئے آیئے اب اس کے بعض اہم اجزاء کا الگ الگ بھی اس پہلو سے جائزہ لے لیں تاکہ یہ حقیقت ذرا

اور نمایاں ہوجائے کہ ان قوانین کا دوسرے قوانین کے مقابلے میں کیا مرتبہ و مقام ہے۔

نکاح

سب سے پہلے نکاح کے مسئلہ کو لیجئے۔ اسلام نے اس معاملہ کو جس نظر سے دیکھا ہے وہ کہیں شاید ہی موجود ملے۔ اسلام نکاح کی نہ صرف اجازت دیتا ہے بلکہ اس کی ترغیب اور تلقین بھی کرتا ہے۔ کیوں کہ اُسکی نگاہ میں ازدواجی رشتوں کا قیام اُس عظیم اور حکیمانہ اسکیم کی ایک ناگزیر کڑی ہے؛ جس کے تحت اس دنیا میں نوعِ انسانی کو پیدا کیا گیا ہے۔ اس بنا پر وہ نکاح کو دو افراد کا نجی معاملہ ہونے سے کہیں زیادہ اہم معاملہ قرار دیتا ہے اور اس کا تعلق زندگی کی صالح تعمیر اور تمدن کے صحیح ارتقا سے جوڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے انعقادِ نکاح کو قانوناً ایسے عوامل سے محفوظ رکھا ہے جو اس تعمیر اور ارتقا کے حق میں تخریبی رول ادا کرنے والے ہوں۔ اس سلسلہ کا نمایاں اور اصولی قانون ایک تو یہ ہے کہ جوازِ نکاح کے لئے مرد اور عورت، دونوں کا مسلمان ہونا ضروری ہے، اس میں صرف ایک استثنا یہ ہے کہ مسلمان مرد کا کتابیہ سے بھی نکاح ہو سکتا ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ کتابیہ سے نکاح میں وہ مفاسد اور خطرات بہت کم ہوتے ہیں جو مشرکہ سے نکاح کرنے کے نتیجے میں یقینی طور سے رونما ہو سکتے ہیں۔ اس کے باوجود کتابیہ سے نکاح کی اسلام نے اجازت ہی دی ہے، اسے پسند نہیں کیا ہے۔ دوسرا اہم قانون یہ ہے کہ انعقادِ نکاح کے لئے مرد اور عورت دونوں کی اپنی آزاد رضامندی کے ساتھ اولیاء کی بھی رضا مطلوب اور بعض حالات میں ناگزیر ہے۔ تیسرا قانون یہ ہے کہ مرد عدل کی شرط کے ساتھ ایک سے زائد چار عورتوں تک سے نکاح کر سکتا ہے۔ نکاح کے اعلیٰ مقاصد اور زندگی کے ٹھوس حقائق پر جس شخص کی بھی نظر ہوگی وہ ان قوانین کی اہمیت سمجھنے سے قاصر نہیں رہ سکتا۔

ہم دینی کی قید واضح طور پر رشتۂ نکاح کی بقاء و استحکام اور مقاصدِ نکاح کے تحفظ کے لئے ایک ناگزیر شے ہے کیوں کہ زوجین کی ذہنی ہم آہنگی اور جذباتی قرب ان کے ازدواجی تعلق

کے کامیاب و بامراد ثابت ہونے کے لئے بالبداہت ضروری ہے اور اس ہم آہنگی اور قرب کا یہ حال ہے کہ بسا اوقات معاشی اور سیاسی نظریات تک کا اختلاف ان کے لئے آزمائش بن جایا کرتا ہے۔ پھر یہ مقصود دینی اختلاف اور اعتقادی تضاد کی موجودگی میں جو کہیں گہری جڑیں رکھتا ہے اور دوررس تقاضوں کا حامل ہوتا ہے، کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟ اب غور کیجئے کہ آیا حقیقت پسندی اور عاقبت اندیشی کی بات یہ ہے کہ جوازِ نکاح کے لئے ہم دینی کو لازم قرار دیا جائے جیسا کہ اسلام نے کیا ہے یا یہ بات ہے کہ دینی اختلاف کو سرے سے خاطر میں نہ لایا جائے اور مختلف عقائد رکھنے والے افراد کے اِزدواج کو جائز ٹھہرا دیا جائے جیسا کہ اسپیشل میرج ایکٹ کے ذریعہ جائز ٹھہرا دیا گیا ہے؟ پورے اطمینان سے کہا جا سکتا ہے کہ جس شخص کے بھی ذہن پر جھوٹی روشن خیالی کا کابوس سوار نہ ہوگا اسے صاف دکھائی دیگا کہ دانشمندی، حقیقت پسندی اور عاقبت بینی کا تقاضا وہی ہے جو اسلام نے اختیار کیا ہے نہ کہ وہ جو اسپیشل میرج ایکٹ اور اس جیسے دوسرے قوانینِ عالم میں اپنایا گیا ہے۔ عورت کے اولیاء کی مرضی کو اس کے معاملۂ نکاح میں ایک حد تک دخیل قرار دینا بھی مقاصدِ نکاح کے حصول کو زیادہ سے زیادہ قابلِ اطمینان بنانے ہی کی غرض سے ہے۔ یہ غرض ایک طرف تو یہ ہے کہ لڑکی کسی ایسے شخص کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں بندھ جانے کا اقدام نہ کر بیٹھے جو دینی اور ایمانی لحاظ سے بہت فروتر ہو یا جو اچھی شہرت نہ رکھتا ہو یا جس کے ساتھ آگے چل کر اس کی زندگی ناکامیوں اور پریشانیوں کے نذر ہو جانے والی ہو، کیوں کہ یہ جانی بوجھی حقیقت ہے کہ وہ ناتجربہ کار اور نسبتاً بھولی ہی نہیں، زیادہ جذباتی بھی ہوتی ہے۔ اس لئے اس امر کا امکان بہرحال ہوتا ہے کہ جذبات کے بہاؤ میں دور تک نہ دیکھ سکے اور معاملہ کے متعدد یا بعض اہم پہلوؤں کو نظر انداز کر دے جب کہ اس کے باپ بھائی نسبتاً کہیں زیادہ بالغ نظر، تجربہ کار اور عاقبت اندیش ہونے کے باعث تمام ضروری پہلوؤں پر نظر رکھ کر ہی کوئی رائے قائم کریں گے۔ اس لئے ان کا اس کے معاملۂ نکاح

میں مناسب حدود کے اندر دخیل قرار دیا جانا عین اس کے اپنے ہی فائدے کی بات ہے۔ اس سے اس کی مرضی سلب نہیں ہوتی، بلکہ اسے صحیح رہنمائی اور مدد ملتی ہے۔ دوسری غرض اس کی یہ ہے کہ ہونیوالے نکاح سے زوجین کے ساتھ ساتھ ان کے خاندانوں کے درمیان بھی الفت و یگانگی پیدا ہو، جو نکاح کا ایک عقلاً اور شرعاً معتبر مقصد ہے۔ بصورتِ دیگر یہ مقصد فوت ہو سکتا ہے۔

اب نو وضع قوانین میں سرپرستوں کی رائے اور صواب دید کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی ہے جیسا کہ ہمارے ملک میں نافذ اسپیشل میرج ایکٹ کا حال ہے۔ ان کی معقولیت پسندی اور حقیقت شناسی کے طول وعرض کا خود اندازہ کر لیجئے۔ کون ہے جو اس کے اختیار کردہ طرزِ فکر کو افراد اور معاشرے کے حق میں صالح اور تعمیری قرار دے سکتا ہے؟

تعددِ ازدواج

اب ایک سے زائد عورتوں سے نکاح کے مسئلے کو لیجئے۔ اسلام کے نزدیک اخلاقی اور سماجی مصالح کی بنا پر تعددِ ازدواج جائز ہے، جب کہ موجودہ دور میں اسے سخت معیوب کہا اور سمجھا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں اگر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ مسئلہ دراصل صرف یہ ہے کہ مرد کو ایک سے زیادہ عورتوں سے جنسی تعلق کی اجازت ہونی چاہئے یا نہیں؟ ہو تو اس کی شرائط و حدود کیا ہوں؟ مغربی تہذیب کا فتویٰ یہ ہے کہ مرد جتنی بھی عورتوں سے چاہے آزاد جنسی تعلق رکھ سکتا ہے۔ طرفین کی رضا کے علاوہ مرد پر نہ کوئی پابندی ہے نہ کوئی ذمہ داری۔ مرد نکاح کرنا چاہتا ہے تو بس ایک عورت سے کر سکتا ہے، دوسری عورت سے نہیں (جیسا کہ ہندو کوڈ میں ہے) ـــــ ہاں بیوی بنائے بغیر جتنی عورتوں سے چاہے جنسی تعلق رکھ سکتا ہے۔ اس صورت میں اس پر نہ عورت کے نان و نفقہ اور رہائش کی ذمہ داری ہوگی، نہ ہونے والی اولاد کی تربیت و کفالت کی، نہ اولاد اسکی جائداد میں حصہ دار ہوگی۔ مغربی تہذیب کے نزدیک یہ صورت عیاشی کی نہیں، عین تہذیب و شائستگی، اور عورت اور اس کی اولاد کے ساتھ سر تا سر

عدل وانصاف کی ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص زنا اور آوارگی کو پسند نہیں کرتا اور ایک عورت کی موجودگی میں دوسری عورت سے شادی کر لیتا ہے، اور عورت اور اس کی اولاد کی تمام ذمہ داریاں اپنے سر لیتا ہے تو مغرب زدہ اصحاب کے نزدیک وہ غیر مہذب، عیاش اور عورتوں پر ظلم ڈھانے والا ہے ع:۔ خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد۔

مغربی تہذیب کے برعکس اسلام آزاد جنسی تعلق، زنا کو بدترین گناہ اور شدید قابلِ تعزیر جرم قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ چیز فرد اور معاشرہ، دونوں کے دین، اخلاق، صحت اور سکون کے لئے تباہ کن، خاندان کے نظام کو کھوکھلا کر دینے والی اور نئی نسل کو باپ کی شفقت وکفالت سے محروم کر دینے والی ہے۔ یہ کہ ہوسناکی و بدکرداری ہی نہیں، عورت اور اس کی اولاد کے ساتھ صریح ظلم بھی ہے۔ کیونکہ آزاد جنسی تعلق کی صورت میں مرد پر عورت اور اس کی اولاد کی کوئی ذمہ داری نہیں آتی۔ وہ عورت کی عفت وآبرو کو لوٹ کر اسے اور اس کی اولاد کو بے سہارا چھوڑ دیتا ہے۔

اسلام کی رو سے جنسی تعلق کی وہی شکل صحیح ہے جو انسان کو آوارہ و بدکردار نہ بنائے، جس سے گھر بسے، خاندان کا نظام قائم ہو، عورت، مرد اور اولاد سب کے حقوق کا کما حقہ تحفظ ہو، نئی نسل کی پرورش ونگہداشت کا معقول نظم ہو۔ اور یہ نکاح ہی کی صورت میں ممکن ہے خواہ ایک عورت سے ہو یا ایک سے زیادہ عورتوں سے

ایک سے زائد عورتوں سے نکاح کے جائز ہونے پر یہودیت، عیسائیت، ہندومت اور اسلام کا اتفاق ہے۔ یہ سب مذاہب تعددِ ازدواج کی اجازت دیتے ہیں، البتہ اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب کے یہاں اس سلسلے میں کوئی حد اور کوئی شرط ہمیں نہیں ملتی، جب کہ اسلام عورتوں کے حقوق کے تحفظ کی خاطر اس غیر محدود اجازت کو محدود اور غیر مشروط اجازت

کو مشروط کرتا ہے۔ اسلام کی عائد کردہ حد یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ چار عورتوں سے شادی کی جاسکتی ہے۔ اس میں کسی بڑے سے بڑے سرمایہ دار یا فرماں روا کے لئے بھی کوئی استثنا نہیں ہے اور شرط یہ ہے کہ دوسری بیوی اسی وقت لائی جاسکتی ہے جب کہ مرد دونوں بیویوں کے حقوق عدل وانصاف کے ساتھ ادا کرنے کو تیار ہو، اس شرط میں بھی کسی کے لئے کوئی استثنا نہیں ہے۔

یہ دو صورتیں ہیں۔ ان کا مقابلہ کر کے بتائیے کہ ان میں سے کون سی صورت عورت کے شرف ووقار کے مطابق اور معاشرہ کو اخلاقی گندگی سے بچانے اور عورت اور اس کی اولاد کے حقوق کا تحفظ کرنے والی ہے۔ آیا یہ صورت کہ مرد کو آزاد جنسی تعلق کی کھلی چھٹی ہو اور وہ جن عورتوں کو تختۂ مشق بنائے، ان کے اور ان کی اولاد کے سلسلے میں اس پر کوئی ذمہ داری نہ ہو یا یہ صورت کہ آزاد جنسی تعلق قطعاً ممنوع ہو، مرد کسی عورت سے جنسی تعلق اسی وقت قائم کرسکے جب کہ وہ اس سے نکاح کر کے اسے اپنے گھر لائے اور اس کے اور اس کی اولاد کے تمام حقوق ادا کرے اور اگر وہ ایک سے زائد عورتوں سے نکاح کرے تو اپنی سب بیویوں کے درمیان عدل وانصاف کرے اور یہ تعداد چار سے کسی صورت میں زیادہ نہ ہو۔

کہا جاسکتا ہے کہ تعددِ ازدواج اور آزاد صنفی تعلق، کیوں نہ دونوں کو ممنوع قرار دیدیا جائے اور صرف یک زوجگی کا رواج باقی رہے؟ جواب یہ ہے کہ کسی بھی انسانی معاشرہ میں ایسا نہ ہوسکا۔ جب بھی تعددِ ازدواج کو ممنوع قرار دیا گیا آزاد جنسی تعلق کی گندگی معاشرے میں پھوٹ پڑی اور ریاست اور معاشرہ، دونوں نے مجبوراً اسے جائز قرار دے لیا۔ مغربی ممالک اس امر کی کھلی ہوئی شہادت ہیں۔ ہمارے ملک میں بھی قانون آزاد جنسی تعلق کو ناجائز قرار نہیں دیتا، نہ اربابِ حکومت اسے ممنوع قرار دینے کے لئے کوئی قانون لانا چاہتے ہیں۔

اسلام نے زنا کے انسداد کے لئے تعددِ ازدواج کو جائز قرار دیا ہے۔ اگر کوئی مرد کسی وجہ

سے مزید کسی عورت سے جنسی ربط قائم کرنا چاہتا ہے تو ضروری ہے کہ شریفوں کی طرح اس سے نکاح کرلے، اس کے اور اس کی اولاد کے حقوق ادا کرے، ساتھ ہی پہلی بیوی اور اسکی اولاد کے ساتھ منصفانہ سلوک کرے۔

پھر تعددِ ازدواج کی اجازت کی یہی ایک مصلحت نہیں ہے، وہ اُن یتیم اور نادار لڑکیوں کے مسئلے کا حل بھی ہے جنھیں اچھے رشتے نہیں ملتے۔ وہ بیوہ اور مطلّقہ عورتوں کے گھر بسانے کا طریقہ بھی ہے جنھیں کنوارے مرد کم پسند کرتے ہیں۔ جنگ کے نتیجے میں مردوں کے گھٹ جانے اور عورتوں کی تعداد کے بڑھ جانے کی پیچیدہ صورتِ حال کا علاج بھی ہے اور اُن مردوں کے مسئلہ کا حل بھی ہے جن کی عورتیں دائم المریض یا لاولد ہیں۔ اسی صورت میں ایسی عورتوں کو طلاق سے بچایا جا سکتا ہے۔

طلاق و فسخِ نکاح

اب مسلم پرسنل لا کے ایک اور اہم قانون، طلاق اور فسخِ نکاح کو بھی لے لیجئے۔ اس سلسلے میں دنیا کے قوانین کا رجحان مختلف رہا ہے۔ کچھ قوانین طلاق اور فسخِ نکاح کے قائل نہیں اور اگر اس کی اجازت دیتے بھی ہیں تو بہت ہی مخصوص حالات میں، جب کہ کچھ دوسرے قوانین اسکی اجازت دیتے ہیں اور اسے زیادہ دشوار بنانے کا رجحان نہیں رکھتے۔ اسلام نے اعتدال کا راستہ اختیار کیا ہے، وہ اس امر کی تو پوری کوشش کرتا ہے کہ جو رشتۂ ازدواج قائم ہوچکا ہے حتی الوسع باقی رہے، لیکن جب اس بات کا قوی اندیشہ ہو جائے کہ یہ رشتہ اب نبھ نہ سکے گا، نہ اپنے مقاصد کو پورا کر سکے گا تو بدرجۂ آخر طلاق کی اجازت دے دیتا ہے۔ طلاق کی اجازت کے ساتھ دوسرا اہم سوال یہ ہے کہ طلاق دینے کا اختیار کسے ہو؟ مغربی قوانین کا فیصلہ یہ ہے کہ طلاق کا حق نہ مرد کو ہے نہ عورت کو، نہ سماج کو یہ حق صرف عدالت کو حاصل ہے۔ یہی فتوی ہندو کوڈ کا بھی ہے لیکن جو لوگ عدالت کے طویل، پُرپیچ اور گراں طریقِ کار سے واقف ہیں اور جو یہ جانتے ہیں کہ غریب اور سادہ لوح عوام کو عدالتوں سے انصاف نہیں ملتا اور جن کی نظر افراد کی عزت و ناموس اور خاندان کے

وقار پر بھی ہوتی ہے وہ اس سے اتفاق نہیں کر سکتے کہ طلاق کے معاملہ کو عدالت کے حوالے کر دیا جائے۔ گھریلو معاملات کا عدالت میں پوسٹ مارٹم کوئی اچھی بات نہیں ہے، نہ ان معاملات کا عدالت میں ثابت کرنا کوئی آسان کام ہے، نہ یہ بات خود عورت کے مفاد میں ہے کہ عدالت میں اسے رسوا اور اس کے عیوب کو طشت از بام کیا جائے۔ مسلم پرسنل لا کی رو سے طلاق دینے کا حق مرد کو ہے جو خاندان کا سربراہ ہے، جو مہر اور دوسرے مصارف برداشت کرتا ہے اور جو عورت اور اولاد کے نان ونفقہ کا بھی ذمہ دار ہے۔ لیکن اگر مرد طلاق نہ دے جب کہ عورت اس سے گلو خلاصی چاہتی ہو تو اس کے لئے بھی راستہ موجود ہے، وہ اس سے خلع حاصل کر سکتی اور اگر مرد اس کے لئے تیار نہ ہو تو عدالت سے مدد لے سکتی ہے۔ بعض خاص حالات میں عورت عدالت کے ذریعہ فسخ نکاح بھی کرا سکتی ہے۔ ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مرد اپنا حقِ طلاق عورت کو تفویض کر دے اس صورت میں عورت خود اس حق کو استعمال کر سکے گی۔ ایک اور سوال یہ ہے کہ طلاق کن اسباب کی بنا پر دی جا سکتی ہے؟ مسیحی یورپ میں پہلے صرف بدکاری کی بنا پر طلاق ہو سکتی تھی، پھر اس میں اور اسباب کا اضافہ ہوا۔ یہ فہرست طویل سے طویل تر ہوتی چلی گئی اور اب تو مغربی قوانین کا رجحان یہ ہے کہ طلاق کے لئے کسی خاص سبب کے ہونے کی ضرورت نہیں ہے، بس اتنی بات کافی ہے کہ فریقین میں سے کوئی طلاق لینا چاہتا ہے۔

ہندو لا میں طلاق کی اجازت نہ تھی اور ہندو کوڈ میں پہلی بار طلاق کی اجازت دی گئی ہے اس لئے فطری طور سے یہ اجازت بہت محدود اور شاذ و نادر حالات ہی میں ہے۔ طلاق کی وجوہ حسبِ ذیل بتائی گئی ہیں۔ بدکاری کی زندگی گزارنا۔ ہندو مذہب کو ترک کر دینا۔ ناقابلِ علاج اور دہشت انگیز جذام، متعدی امراض خبیثہ، سنیاس لینا، مفقود الخبر ہونا۔ گویا میاں بیوی کی شدید سے شدید ناچاقی اور ان میں کسی طرح نباہ نہ ہو سکنا طلاق کی وجہ نہیں ہو سکتی۔ مزید یہ کہ چند بار کی بدکاری بھی وجہِ طلاق نہیں بن سکتی "بدکاری کی زندگی" ہونی چاہئے اور پھر اسے عدالت میں ثابت بھی کیا جائے۔ کیا یہ کوئی

آسان بات ہے ؟ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک مرد اگر اپنی عورت کو بچشم خود بدکاری کی حالت میں دیکھ لے تب بھی وہ اس سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا۔ اِلّا یہ کہ وہ اسے مسلسل بدکاری کرتے ہوئے دیکھے، اس کے ثبوت فراہم کرتا رہے اور عدالت میں ثابت کرنے میں کامیاب بھی ہو جائے، بصورتِ دیگر وہ اس کی بیوی رہے گی اور ہندو کوڈ کی رو سے وہ کسی اور عورت سے شادی بھی نہ کر سکے گا۔ ایسی عورت کو کون باحمیّت شخص اپنی بیوی بنا کر رکھ سکتا ہے ؟ وہ تو اس کی جان، مال اور آبرو کے لئے سخت خطرہ بنی رہے گی۔

پھر اس کوڈ کی رو سے طلاق کی درخواست نکاح کے تین سال بعد ہی دی جا سکتی ہے اور عدالت سے طلاق کی ڈگری مل جانے اور عدالتِ عالیہ سے اپیل کے خارج ہو جانے کے ایک سال بعد مرد اور عورت دوسری شادی کر سکتے ہیں، اس سے پہلے نہیں۔ ذرا سوچئے تو سہی ! کیا یہ عملی دنیا کی باتیں ہیں ؟ اور کیا اِس طرح کے دشوار اور پیچیدہ قوانین مرد، عورت، اولاد اور معاشرہ سب کے لئے پریشانی کا موجب نہ ہونگے ؟

طلاق کا اسلامی طریقہ

یہ ہے طلاق کا وہ پُرپیچ، دشوار اور غیر عملی طریقہ جو ہندو کوڈ میں ہے اور جسے پورے ملک میں نافذ کیا جانا پیشِ نظر ہے۔ اب ذرا اسلام کے طریقِ طلاق کو تفصیل سے سمجھ لیجئے کہ وہ کس قدر عملی، سادہ اور حکیمانہ ہے۔

نکاح کے وقت جو خطبہ دیا جاتا ہے، اُس میں قرآن کی تین آیتیں تلاوت کی جاتی ہیں، اِن آیتوں میں چار بار اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ اہلِ ایمان کو خدا کی نافرمانی سے بچنا اور اس کے عذاب سے ڈرنا چاہئے۔ اسی کے ساتھ اِن آیات میں خاندان والوں کے حقوق کی پاسداری اور زبان کے صحیح استعمال پر زور دیا گیا ہے، یہ سب ہدایات رشتۂ نکاح کو مستحکم کرنے اور میاں بیوی کے تعلقات کو بہتر بنانے کے لئے ہیں۔

نکاح کے بعد دو اجنبی مرد عورت، میاں بیوی بن جاتے ہیں جن کے حقوق و فرائض کو اسلام نے تفصیل سے بیان کیا ہے، اِن کی ادائیگی دنیا میں خوشگوار زندگی اور آخرت میں اجرِ عظیم کی ضامن ہے اور ان میں کوتاہی دنیوی ناکامی اور اخروی عذاب کی موجب ہے۔ اِن حقوق و فرائض کا خلاصہ یہ ہے کہ عورت جائز امور میں شوہر کی اطاعت کرے اور شوہر نہ صرف یہ کہ عورت کے نان، نفقہ، رہائش وغیرہ جملہ ضروریاتِ زندگی کی فراہمی کا بندوبست کرے بلکہ اس سے بہتر سے بہتر انداز سے پیش آئے اور اس کی کوتاہیوں کو نظر انداز کرے۔

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا ۝

(النساء، ۱۹)

اور ان کے ساتھ اچھی طرح سے رہو سہو، تو اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو عجب نہیں کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور خدا اس میں بہت سا خیر پیدا کر دے!

اسی بات کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن الفاظ میں بیان فرمایا ہے:۔

اِسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا فَإِنَّهُنَّ خُلِقْنَ مِنْ ضِلَعٍ وَإِنَّ أَعْوَجَ شَيْءٍ فِي الضِّلَعِ أَعْلَاهُ فَإِنْ ذَهَبْتَ تُقِيمُهُ كَسَرْتَهُ وَإِنْ تَرَكْتَهُ لَمْ يَزَلْ أَعْوَجَ فَاسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ

(بخاری، مسلم)

عورتوں کے بارے میں حسنِ سلوک کی، میری نصیحت قبول کرو، ان کی تخلیق پسلی سے ہے اور پسلی میں سب سے ٹیڑھا حصہ اوپر کا حصہ ہے تو اگر تم پسلی کو سیدھا کرنے کے درپے ہوگے تو وہ ٹوٹ جائیگی اور اسے (اس کے حال پر) چھوڑ دوگے تو کج رہیگی تو عورتوں کے بارے میں میری نصیحت قبول کرو!

مندرجہ بالا آیت و حدیث میں کتنے عمدہ انداز میں بیوی کی جذباتیت اور اس کی کوتاہیوں کو برداشت کرنے اور اس کے ساتھ بہترین سلوک کرنے کی تلقین کی گئی ہے اور بیوی کے ناپسند ہونے

کے باوجود طلاق میں جلد بازی سے روکا گیا ہے۔

اِن ہدایات کے باوجود اگر میاں بیوی میں نباہ نہ ہو سکے تو دونوں خاندانوں کے حَکَم بیٹھ کر معاملات کو سلجھانے کی کوشش کریں۔

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَیْنِہِمَا فَابْعَثُوْا حَکَمًا مِّنْ اَھْلِہٖ وَحَکَمًا مِّنْ اَھْلِہَا اِنْ یُّرِیْدَا اِصْلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰہُ بَیْنَہُمَا

(نساء، ۳۵)

اور اگر تمہیں ان دونوں کی ناچاقی کا ڈر ہو تو مرد کے خاندان کے ایک حَکَم اور عورت کے خاندان کے ایک حَکَم کو (اصلاحِ حال کے لئے) مقرر کردو، اگر دونوں اصلاحِ حال چاہیں گے تو اللہ دونوں میں موافقت پیدا کردے گا۔

یہ حَکَم بھی اگر معاملات کو سلجھا نہ سکیں اور مرد اور عورت میں نباہ کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکے تو یہ وقت ہے جب طلاق دی جا سکتی ہے، وہ طلاق جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اَبْغَضُ الْحَلَالِ الطَّلَاقُ — حلال چیزوں میں مبغوض ترین شے طلاق ہے — فرمایا ہے۔

لیکن طلاق دینے کا یہ طریقہ کہ ایک سانس میں تین یا زائد طلاقیں دے دی جائیں، بدعت، ناجائز اور مرد، عورت، اولاد اور دونوں کے خاندانوں کے لئے تباہ کن ہے۔ حضرت عمرؓ ایسا کرنے والوں کو کوڑے کی سزا دیتے تھے۔ صحیح اور سنتِ رسولؐ سے ثابت طریقہ یہ ہے کہ ایک وقت میں صرف ایک طلاق دی جائے اور ایک ہی طلاق پر بس کیا جائے تاکہ عدّت کی مدّت کے اندر، جو تین حیض یا تین ماہ یا وضعِ حمل کی مدت ہے، شوہر کو رجوع کرنے کا اور عدّت گزرنے کے بعد، عورت اور مرد، دونوں کے راضی ہونے پر دوبارہ نکاح کرنے کا موقع باقی رہے اور طلاق کے بعد کفِ افسوس نہ ملنا پڑے۔

پھر ایک طلاق کے بارے میں بھی یہ ہدایت ہے کہ وہ حیض کی حالت میں نہ دی جائے جب کہ مرد کو عورت کی طرف رغبت نہیں ہوتی بلکہ پاکیزگی کے زمانے میں دی جائے اور اگر اس زمانے میں اس نے عورت سے مباشرت کرلی ہے تو اس پاکیزگی کے زمانے میں طلاق دینے کے بجائے وہ اگلی پاکیزگی کا انتظار کرے جب کہ اس نے عورت سے مباشرت نہ کی ہو — یہ سب اس لئے کہ یہ ناخوشگوار واقعہ اگر ٹل سکے تو ٹل جائے اور طلاق جب بھی ہو، سوچ سمجھ کر ہو۔

یہ ہے اسلام کا تجویز کردہ طریقِ طلاق! اتنا متوازن، حکیمانہ اور عملی طریقِ طلاق کیا کہیں اور پایا جاتا ہے!

حضرات! اسلام کے قوانین شخصی کے بعض اجزاء کا یہ تھوڑا سا تعارف اس حقیقت کی طرف رہنمائی کرنے کے لئے کافی ہے کہ یہ کتنے متوازن، کتنے حقیقت پسندانہ، کتنے مفید اور کتنے تعمیری اور صالح قوانین ہیں۔ ان قوانین کا تو حق یہ تھا کہ پورے ملک میں انھیں اپنا لیا جاتا اور ان کی خوبیوں سے فائدہ اٹھایا جاتا۔ مگر یہ کتنے رنج اور افسوس کی بات ہے کہ انھیں سرے سے منسوخ کردینے کی باتیں ہو رہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی باتوں کو کوئی بھی بالغ نظر شخص، بالخصوص کوئی بھی مسلمان برداشت نہیں کر سکتا۔

حکومت سے مطالبات

حضرات! ان معروضات سے اندازہ ہوگیا ہوگا کہ مسلمان اپنے پرسنل لا میں کسی ترمیم و تنسیخ کے لئے کیوں تیار نہیں ہیں اور ایسا کوئی اقدام ملک اور ملت کے لئے کس درجہ ضرر رساں ہے! لہٰذا ذیل میں حکومت سے مسلمانوں کے حسب ذیل مطالبات ہیں:۔

(۱) رہنما اصولوں میں سے دفعہ ۴۴، جو یکساں سول کوڈ سے متعلق ہے، منسوخ ہو۔

(۲) مسلم پرسنل لا میں حکومت کوئی ترمیم نہ کرے۔

(٣) اسپیشل میرج ایکٹ کا اطلاق مسلمانوں پر نہ ہو۔

(۴) متبنّیٰ بل ۱۹۷۲ء (Adoption of Children Bill 1972) واپس لیا جائے یا کم از کم مسلمانوں کو اس کے دائرۂ اثر سے خارج کیا جائے۔

(۵) حکومت آئندہ کوئی ایسا بل نہ لائے جس کا منشا یکساں سول کوڈ کو جزءً جزءً نافذ کرنا ہو جیسا کہ وہ اس وقت کر رہی ہے۔

جب تک یہ مطالبات پورے نہ ہوں گے مسلمانوں کو چین نصیب نہ ہوگا اور وہ یہ محسوس نہ کر سکیں گے کہ ان کا دین و ایمان اور ان کی شریعت و تہذیب ملک میں محفوظ ہے۔

مسلمانوں کے کرنے کے کام

لیکن صرف ان مطالبات کے منوانے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا، اس سلسلہ میں مسلمانوں کو بھی کچھ کام کرنے ہوں گے۔ ان کاموں کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

(۱) مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کی چیخ پکار کی ایک بڑی وجہ وہ مشکلات اور ناانصافیاں ہیں جن سے اس وقت مسلم معاشرہ دوچار ہے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ ان مشکلات اور ناانصافیوں کی وجہ مسلم پرسنل لا ہے حالاں کہ اس کی اصل وجہ مسلمانوں کی جہالت اور دین سے ان کی دوری اور مسلم پرسنل لا کا استعمال نہ کرنا ہے۔ یہ صورتِ حال اسی وقت ٹھیک ہو سکتی ہے جب مسلمانوں میں دین کا علم اور اس پر عمل عام ہو، ان کا معاشرہ صحیح اسلامی معاشرہ ہو، شریعت نے معاشرہ کے مختلف افراد پر جو ذمہ داریاں عائد کی ہیں اور ایک کے دوسرے پر جو حقوق متعین کیے ہیں ان کا شعور اور ان کے ادا کرنے کا جذبہ بیدار ہو۔ اگر ایسا ہو جائے تو وہ بہت سے مسائل خودبخود ختم ہو جائیں گے جو اس وقت بعض لوگوں کے دماغوں کو پریشان کر رہے ہیں۔

(۲) علماء اور مسلم ماہرینِ قانون کا ایک بورڈ تشکیل دیا جائے جو موجودہ محمڈن لا پر کتاب و

سنت اور فقہِ اسلامی کی روشنی میں نظر ثانی کرے اور یہ دیکھے کہ موجودہ حالات و ضروریات کے تحت کتاب و سنت اور فقہِ اسلامی کے دائرے کے اندر موجودہ محمڈن لا میں کیا اصلاحات ہو سکتی ہیں کہ شریعت کا منشا بھی پورا ہو اور مسائل بھی حل ہوں۔

(۳) مسلم پرسنل لا کو دفعہ وار مدوّن کیا جائے تاکہ اس سے استفادہ میں آسانی ہو۔

(۴) شرعی پنچایتیں قائم کی جائیں جو اسلامی عدالتوں کی عدم موجودگی میں فسخ، خلع اور دوسرے مسائل کے سلسلہ میں فیصلے کریں۔ یہ پنچایتیں مسلمان قائم کریں۔ اپنے شخصی معاملات میں انہی سے رجوع کریں اور قانوناً ان کا فیصلہ واجب التعمیل ہو۔

(۵) مرافعہ کے لئے ہر ریاست میں علماء کا ایک بورڈ قائم کیا جائے۔

(۶) مسلسل تعلیم و تبلیغ کے ذریعہ مسلم پرسنل لا کے اس مدوّن شدہ ضابطے کے اہم اجزاء سے عام مسلمانوں کو واقف کرایا جائے۔

اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ علماء، خطباء، مصنفین اور مقررین حقوق العباد اور معاشرتی و عائلی زندگی کے مسائل بیان کرنے کی طرف توجہ دیں اور نکاح، طلاق اور میراث وغیرہ امور اور زوجین کے حقوق و فرائض کے سلسلہ کی ضروری تفصیلات سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو آگاہ کریں۔ نیز ان بشارتوں اور وعیدوں سے بھی باخبر کریں جو اہلِ خاندان کی حق شناسی و حق تلفی کے سلسلہ میں قرآن و حدیث میں وارد ہیں۔ نکاح کا خطبہ دیتے وقت بھی ان امور کی تھوڑی سی تشریح مناسب رہے گی اور یہ بھی مناسب ہے کہ نکاح کے سرٹیفکیٹ کے ساتھ ایک مختصر سا کتابچہ زوجین کے حوالے کیا جائے جس میں ان کے حقوق و فرائض اور نکاح و طلاق کے موٹے موٹے مسائل درج ہوں۔

حضرات! یقیناً طوفان شدید ہے لیکن ہم اگر حکمت و دانش، عزم و اتحاد اور توکل علی اللہ سے کام لے کر آگے بڑھیں تو نصرتِ ایزدی سے اس طوفان میں اپنے لئے راستہ نکال سکتے ہیں۔

وَاللّٰہُ خَیْرُ النّٰاصِرِیْنَ!